علم النفسیات کا ایک افادی پہلو[1]

۶

وفی انفسکم افلا تبصرون

(ذاتی مشاہدہ)

(جناب لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب کراچی)

گذشتہ اوراق سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ علمِ تصوّف کی سائنٹیفک تشریح ہم کو اسلامی تصوّف کے کس قدر قریب لاتی جارہی ہے اور اس کو سمجھنے میں مغربی فلسفہ و نفسیات کی جدید تشخیصات ہمیں کہاں تک مدد دیتی ہیں۔ یہ ایک متاسفانہ حقیقت ہے کہ مغرب کا سائنٹیفک فکر ہمارے ہی صوفیائے کرام کے سلسلوں کا مرہونِ منّت ہے، جس کو ہم نے لائقِ توجّہ نہ سمجھا۔ یہ سب کچھ اسی اسلامی فکر کی ایک ترقی یافتہ کڑی ہے۔

مادیت نے جب سے مغرب میں دم توڑنا شروع کیا ہے، اہلِ مغرب روحانیت کا سہارا ڈھونڈھ رہے ہیں

---

[1] اس سلسلہ کی مندرجہ ذیل اقساط برہان میں شائع ہوچکی ہیں۔

(۱) علم النفسیات کا ایک افادی پہلو — اگست ۱۹۴۶ء

(۲) 〃 〃 〃 (معرفتِ نفس معرفتِ رب کا ذریعہ کیونکر بنتی ہے) — نومبر ۱۹۴۶ء

(۳) علم النفسیات کا ایک افادی پہلو (خواب، ضبط، زندگی اور حرارت) — اپریل ۱۹۴۷ء

(۴) علم النفسیات کا ایک افادی پہلو (〃 〃 〃 〃 〃) — مئی ۱۹۴۷ء

(۵) علم النفسیات کا ایک افادی پہلو (ذکر کی فضیلت اور ماہیت) — اکتوبر ۱۹۶۰ء

اور اسی تلاش و جستجو میں انہیں ہمارے ہی رشتہ کی ایک کڑی سسکتی ہوئی نظر پڑی، جس میں انھوں نے روحانی حیاتین کا انجکشن دیکر از سرِ نو زندۂ جاوید کر دیا۔ علمار مغرب جو جو نظریئے اب روحانیت کے پیش کر رہے ہیں وہ ہمارے ہی صوفیائے کرام کے کلام سے خوشہ چینیاں ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے ہی تساہل کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اگر کبھی ہماری نگاہ ان پر پڑی بھی تو ان کی اہمیت سمجھ میں نہ آئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب سے مغرب علم کا گہوارہ بنا ہے تمام ترقی اسی کے حصہ میں آگئی۔ ہم اُس کی تحقیقات کو متحیر ہو کر دیکھتے رہے اور یہ نہ سمجھا کہ جس مقام پر علوم کو ہم نے چھوڑا تھا اس کا سلسلہ خود ہمارے اپنے ہاتھوں سے قطعی طور پر ہم سے چھوٹ گیا۔ مستشرقین نے جب ہمارے علوم اپنا لئے تو انھوں نے متواتر اُن کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق جاری رکھی۔ یہ بات کچھ زیادہ دور کی نہیں ڈیڑھ سو برس سے ہم پر ایک ذہنی جمود اس طرح طاری ہو چکا ہے کہ ہم خود اپنے ہی علمار کے کارناموں سے بے خبر ہو گئے ہیں اور اُن کو پہچان نہیں سکتے بظاہر مغرب میں وجودیت (EXISTENTIALISM) اور روحانیت (SPIRITUALISM) میں لا انتہا ترقیاں ہوئیں اور ہم تک اِن سے پہونچیں۔ مگر جو ایسے نظریات کے ذخیرے خود ہمارے ہاں موجود تھے وہ سب ہم سے پوشیدہ رہے۔ ہم غور نہ کر سکے۔ ان علوم و معارف کی اصطلاحات سے ہم نامانوس ہو گئے لیکن جونہی یہ لوٹ کر مغرب سے تازہ وارد ہوئیں تو ہم نے ان کے مترادفات ڈھونڈھ نکالے۔ ہم نے دیکھا کہ ان موضوعات کا ایک بیش بہا ذخیرہ خود ہمارے ہاں پہلے سے موجود ہے! لیکن گذشتہ دو صدیوں سے ایک ایسا ذہنی خلا آ موجود ہوا ہے کہ اُسے پُر کرنے کی کسی کو ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جو علمار اس عرصہ میں ہمارے ہاں پیدا ہوئے اُن کی نگاہ بھی اس طرف نہیں اُٹھی۔ وہ بھی اور اور غیر ضروری مسائل میں اُلجھ کر رہ گئے، اصل کام جو تھا وہ مغرب کے لئے چھوڑ دیا۔ اس دُکھ کی داستان بہت طویل ہے اور اس وقت ہم اُس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ ایک آدھ مثال پر اکتفا کریں گے۔

اقبال سے پہلے دنیائے اسلام نے ہندوستان میں تین مفکر پیدا کئے جو ایسے ہیں کہ اُن کی طرف پورے طور پر توجہ نہیں دی گئی (۱) مجدد الف ثانی (۲) مرزا عبدالقادر بیدل اور (۳) شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ جیسا جید فارسی ادبیات اور فلسفہ کا عالم روز روز کہاں پیدا ہوتا ہے۔

مگر انھوں نے بھی مرزا عبد القادر بیدل کے کلام کو اہمیت نہ دی اور اس کی عظمت کو نہ سمجھا۔ ہمارے ہاں بیدل تخیل کا بادشاہ اور ندرتِ بیان کا خدا سمجھا جاتا ہے۔ تصوف کی دنیا میں بیدل کا مقام بہت بلند ہے، اور جو جو رموز و نکات اس کے ہاں موجود ہیں مغرب ابھی تک ان کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کے باوجود بیدل روحانی دنیا سے بڑا بے نیاز نظر آتا ہے حالانکہ اس موضوع پر اس کی گرفت بڑی پختہ اور تجربہ کارانہ ہے۔ ع

درہائے فردوس وابود امروز از بے دماغی گفتم — فردا

وجودیت اور روحانیت کی تعلیم جو اس کے ہاں موجود ہے وہ دانایانِ مغرب کے افکار میں ناپید ہے اس کا کلام حقائق و معارف سے پُر ہے۔ یہ بیدل ہی تو تھا جس نے اوّل اوّل دل کو آئینۂ تمثال بڑے پیار سے پکارا تھا! بیدل تمام کائنات کو کلمات تصور کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ یہ کلمات حروف سے تخلیق دیئے گئے ہیں جو کتابِ کائنات میں مصوّر ہیں اور یہ مصوّر حروف اشیاء کی صورتیں ہیں جو ہم دیکھتے اور سنتے ہیں۔ اور اسی آئینۂ تمثال کے توسط سے ہم اُن کا ادراک کرتے ہیں۔ بیدل کے ہاں وہ سب کچھ موجود ہے جو آؤسپنسکی (OUSPENSKY.) اور مارٹن بوبر[1] (MARTIN BUBER) نے تحقیق کیا ہے۔

---

[1] بیدل اور بوبر میں ایک گونہ مماثلت نظر آتی ہے اور بوبر اس صدی کا بہت بڑا مفکر گذرا ہے۔ اس کی ایک مختصر سی کتاب جو اگرچہ حجم میں بہت چھوٹی ہے۔ مگر اس نے برعظیم یورپ پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ اقبال نے بھی ایک مقام پر بوبر کا حوالہ دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے بھی اس کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا (اس ضمن میں ایک لطیفہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کچھ عرصہ ہوا ہم نے یہاں ایک آکادمی کے ذریعہ دو ہزار روپیہ انعام کا اعلان کروایا کہ "اقبال پر بیدل اور بوبر کا اثر" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جائے اور بہترین لکھنے والوں کو یہ انعام دیا جائے گا۔ اس آکادمی کی کمیٹی کے ممبر صاحب علم اور اقبال پرست سمجھے جاتے ہیں، اعلان سے پہلے جب اُن کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو اُن میں کا ایک فرد بھی بوبر سے واقف نہ تھا! خیر مقالہ کسی نے نہ لکھا' بات آئی جانی ہو گئی۔ حال ہی میں مغرب کی ایک مستشرق عورت ڈاکٹر شمیل (SCHIMMEL.) سے ملاقات ہوئی' یہ عربی فارسی اور ترکی ادبیات میں بڑی ماہر ہیں اور انقرہ یونیورسٹی میں استاد رہ چکی ہیں آجکل سندھی سیکھ رہی ہیں تاکہ شاہ عبد اللطیف بھٹائی پر کام کر سکیں۔ ملاقات کے دوران میں میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے رومی اور اقبال پر تو خوب کام کیا ہے اب بیدل پر بھی کام کریں (مسلسل)

بیدل کا کلام بڑا سنگین اور مشکل ہے۔ تاہم جہاں جہاں اور جب کبھی بھی کسی جگہ پر معانی کی کچھ جھلک پڑتی ہے تو ذہن کے کئی ایک اندھیرے خانے منور ہو جاتے ہیں۔ ہمارے جیسے بندی کے لئے بیدل کا کلام سمجھنا جوئے شیر آوردن کے برابر ہے۔

کہنے لگیں بیدل بڑا مشکل ہے اور مجھے اس پر کوئی تنقیدی کتاب نہیں مل سکی سوائے خواجہ عبداللہ اختر مرحوم کے "بیدل" کے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میرے پاس کلیاتِ بیدل کا انتخاب تو ہے مگر اس کے "چہار عنصر" نہیں مل سکے باتوں میں بات وجودیت (EXISTENTIALISM) کی طرف نکل گئی تو بیدل اور بوبر کا موازنہ شروع ہو گیا۔ کہنے لگیں کہ اقبال نے بھی تو بوبر کا ذکر کیا ہے! میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے ایک مغربی عورت کے منہ سے یہ حوالہ سنا۔ اس مغربی عورت نے اقبال کا مطالعہ کس قدر دقتِ نظر سے کیا ہوا تھا۔ جو بات یہاں کے اقبالی ماہروں سے پوشیدہ تھی وہ اس سے بخوبی واقف تھی۔ کیوں نہ ہوتی آخر اس نے جاوید نامہ کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا ہوا تھا اور یہ خود شاعرہ بھی ہیں!) بہت ممکن ہے اقبال نے اپنے نظریۂ خودی میں کچھ تاثرات بوبر سے مستعار لئے ہوں۔ بوبر کی جس مختصر کتاب کا ذکر ہم نے کیا ہے اس کا نام "I & THOU" یعنی من و تو ہے۔ بوبر خود یہودی ہونے کے سبب سے، یہودی تصوف سے بے حد متاثر تھا اور یہ کتاب یقیناً صوفیانہ ہے لیکن اس کا تعلق اس قسم کے تصوف سے ہے جو بڑا اونچا تصوف ہے اور جس میں حقیقی طور پر اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا راستہ بتایا گیا ہے۔ اس کا تعلق جذب و سلوک اور واردات سے ہے۔ ہمارے اس موضوع سے متعلق بوبر کہتا ہے کہ انسان کے مابین جو اندازِ فکر یا رویہ (ATTITUDE) کا اختلاف موجود ہے تو وہ اختلاف شخصیتوں کا ہے۔ بیدل کی ایک غزل کا عنوان بھی "من و تو" ہے! اس نوٹ میں اس کا درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ غزل ہماری کتاب :- "I & THOU" پر خواجہ عبیداللہ اختر مرحوم مصنف "بیدل" نے تلاش کر کے لکھی ہوئی تھی جو حال ہی میں ہماری نظر سے گذری ہے۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ مرحوم بیدل پر کچھ اور کام بھی کر رہے تھے نہ معلوم اُن کے مسودات کیا ہوئے۔ بیدل پر جو بنیادی کام وہ کر گئے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ یہ خط شکست میں لکھی ہوئی تھی۔ مجتبیٰ حفیظ ہوشیارپوری صاحب نے ہمارے لئے اسے صاف کر کے لکھ دیا جس کے لئے سراپا سپاس ہوں ورنہ مجھ سے تو شاید مرحوم کا شکستہ خط بھی نہ پڑھا جاتا۔ اب آپ غزل ملاحظہ فرمائیے :-

چو "ہست" مطلق آید در اشارت — بلفظِ "من" کنند از دے عبارت
حقیقت کز تعین شد معین — تو اورا در عبارت گفتۂ "من"
من و تو عارض وجودیم — مشبکہائے مشکلات وجودیم
ہمہ یک نور دان اشباح ارواح — گہ از آئینہ پیدا گہ ز مصباح
چو کردی پیشوائے خود خرد را — نمی دانی ز جزو خویش خود را

کاش ہمارے علمائے ادبیات فارسی اس طرف توجہ فرمائیں اور ہمارے لئے کلام بیدل کا سمجھنا آسان بنا دیں۔ خود بیدل بھی تو طلب و خبر، فکر و نظر کی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتا ہے کہ شاید کوئی اس حقیقت کو پا جائے ع

طلبِ تو لبس بود آنقدر کہ ز معنی ببری خبر | بخودت اگر نہ رسد نظر بخیال ہیچ و خدا طلب

ہم آئندہ صفحات میں شعور کی بیداری کے تحت ذاتی مشاہدہ (SELF OBSERVATION.) اور خود آگاہی (SELF REMEMBERING) کا مفصل ذکر کریں گے بطور تمہید ہم یہاں عرض کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ جدید مغربی نفسیات کے یہ دونوں عمل بیدل کے ہاں ملتے ہیں اور ان سے وہ بھی وہی نتائج برآمد کرتا ہے جو جدید مغربی فلسفہ اور نفسیات سمجھتے ہیں۔ المختصر یہ کہ بیدل کے ہاں ہمیں وہ سب کچھ ملتا ہے جس کی تلاش ہم مغربی فلسفہ اور روحانیات میں کرتے ہیں۔ بیدل جمال شعور اور حقیقت و مجاز کے متعلق بھی بعض نکتے خوب بیان کرتا ہے۔ اس کی ایک مختصر سی غزل بڑی پر معنی ہے۔ ع

چیست بیداری زباغِ وہم و ظن گل چیدنی | خواب یعنی از غبارِ خود نظر دزدیدنی

کبر و ناز و آئینہ نقشے کہ نتواں بست ہیچ | ما و من تعبیرِ خوابِ دیدن و نادیدنی

سازِ ہستی و عدم بست و کشادِ چشم ماست | خواب و بیداری ندارد بیش ازیں فہمیدنی

بیدل کہتا ہے کہ بیداری کا تقاضا یہی ہے کہ انسان آگاہ ہو کر باشعور ہو جائے، چونکہ

بقیہ حاشیہ صفہ

برو اے خواجہ خود را نیک بشناس | کہ نبود فربہی مانندِ آماس

"من" و "تو" برتر از جان و تن آمد | کہ ایں ہر دو ز اجزائے "من" آمد

بلفظِ "من" ز انسان است مخصوص | کہ تا گوئی بدو جان است مخصوص

یکے رہ برتر از کون و مکاں شو | جہاں بگذار و خود در خود جہان شو

بود "ہستی" "بہشت" "امکان" "چو دوزخ" | "من" و "تو" در میاں مانندِ برزخ

چو برخیزد ترا ایں پردہ از پیش | نماند نیز حکم مذہب و کیش

ہمہ حکم شریعت از من و تست | کہ آن بربستہ جان و تن تست

من و تو چوں نماند در میانہ
چہ کعبہ چہ کنشت و دیر خانہ

انسان زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کا متمنی ہوتا ہے اس پکڑ دھکڑ میں کئی فتنے جاگ اٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم سو جاتے ہیں، اور پھر جونہی ہم بیدار ہوتے ہیں یہ فتنے رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ آگہی اور بیداری ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہ بات مندرجہ ذیل اشعار سے اور بھی واضح ہو جائیگی ع

آگہی طوفانِ غفلت ریخت بیدل برجہان　　　عالمے بیدار بود این فتنہ ناخوابیدہ را

یہی کیفیت مغربی فلسفہ و نفسیات کے مطابق اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بالائی مراکز سے اثباتی جذبات کے تاثر کا عکس نمودار ہوتا ہے جس کے لئے اچھی خاصی ریاضت درکار ہے۔ جس کا ذکر ہم پچھلی قسط میں کر آئے ہیں۔ گرجیف کی تعلیم جو ہم تک آؤسپنسکی کے توسط سے پہنچی ہے وہ اُسے ورک (WORK) کا نام دیتا ہے۔ اب خواہ آپ اس سے "شغل" کا مطلب لیں یا ریاضت و چلہ کشی اور یا پھر اجپیا۔ حقیقت ایک ہی ہے۔ یہ سب کچھ ضمناً چلا آیا ہے۔ اب ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مدارج شعور اور اس کی بیداری

ہم نے گذشتہ قسط کے اواخر میں قرأۃ بہ عملِ ترتیل کا ذکر کیا تھا۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ اس عمل سے جو صدا پیدا ہوتی ہے وہ عام محاورے میں دل کے تاروں کی صدا کہلاتی ہے اور یہ تار بھی ہم نے گنوا دیئے تھے۔ ان تاروں کی ہم آہنگی سے جو نغمہ پیدا ہوتا ہے اس سے ملأ اعلیٰ کی مخلوق جنبش میں آ جاتی ہے، لیکن یہی تار اگر زنگار خوردہ ہوں تو ان کی آلودگی سے قلبِ انسانی کا مزاج بے کیف ہو جاتا ہے۔ اور اس کا شعور تحت الشعور کے تہہ خانوں میں گر جاتا ہے۔ اور اس پر ایک مسلسل نیند کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ سو جاتا ہے اور بڑی گہری نیند سو جاتا ہے۔ جب انسان پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو اس سے جس قدر بھی حرکات سرزد ہوتے ہیں وہ میکانکی (MECHANICAL.) یا مشینی حرکات کے مشابہ ہوتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی اکثریت اسی حالت میں بہہ رہی ہے۔ صرف وہ لوگ بیدار ہیں جو اپنے آپ کو جگا لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ بیداری یا خود آگاہی، یعنی اپنے آپ کو یاد (SELF REMEMBRING) کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ خود آگاہی (اپنے آپ کو یاد رکھنا) سے مطلب یہ ہے کہ اپنے منفی جذبات (NEGATIVE EMOTIONS) پر غور کیا جائے اور اپنی تمام وہ نفسانی خواہشات جن سے ہم وابستہ ہو چکے ہیں، آہستہ آہستہ ان کو ذہن میں لا کر ان پر قابو پا لیا جائے اور انہیں علیحدہ کر دیا جائے۔ یہ خواہشات ذاتی مشاہدہ

(SELF REMEMBERING) سے ذہن میں اُترنا شروع ہوجاتی ہیں اور جب انسان خود اپنے وجود کا مطالعہ کرتا ہے تو اپنی حرکات کو دیکھتا ہے جن میں اسے اپنی نامناسب حرکات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ جونہی اُسے ان باتوں کا احساس ہونا شروع ہوتا ہے اس کے اندر ایک ہلکی سی روشنی سی شعاع داخل ہوتی ہے اور اُن اندھیرے خانوں کو منوّر کرتی ہے جو اس کے ذہن میں منفی جذبات نے ڈھانپ رکھے تھے۔ اسی ذاتی مشاہدہ سے انسان اپنے ناپسندیدہ افعال کا معائنہ کرتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک خوش فہمی میں مبتلا ہے جو اُسے خودستائی کی طرف کھینچتی لئے چلی جارہی، وہ مسلسل اپنے آپ کے ساتھ جھوٹ بولتا چلا جاتا ہے۔ خودستائی اور خوش فہمی میں بہت کم فرق ہے۔ ان دونوں کے زیر اثر جو کام بھی انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ بہت گھٹیا قسم کا ہوتا ہے۔ کیونکہ جو قوت کام کرنے میں صرف ہونا چاہئے تھی وہ خودستائی میں خرچ ہوجاتی ہے، ایسے کاموں میں نہ تو کوئی تقویت ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی اصلیت اور نہ ہی ایسے اعمال سے وجود میں بلندی آتی ہے۔ اس کا تدارک صرف شعور کی بیداری سے ہوسکتا ہے۔ اس حقیقت کی اہمیت ذاتی مشاہدہ سے اُجاگر ہوتی ہے۔ اس کی کچھ تفصیل ہم لکھ آئے ہیں۔ ایسے مشاہدہ یا مطالعہ سے انسان کی ذات کو ایک صدمہ (SHOCK) محسوس ہوتا ہے جو اس کو نیند سے جگانے کا موجب بن جاتا ہے۔ اگر اس قسم کے صدمے شخصیت کو متواتر لگتے رہیں تو انسان کی نقلی شخصیت جو مستی کے عالم میں بے خود ہوکر سو رہتی ہے بیدار ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو انسان ایک مشین کی طرح حرکات کرتا چلا جاتا ہے جس میں نہ تو احساس کا شائبہ ہوتا ہے اور نہ ہی شعور کا۔ مشینی حرکات اور شعوری حرکات میں صرف یہی ایک فرق ہے کہ شعور کو بیدار کیا جاسکتا ہے، مگر مشین بیدار نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے اگر انسانی حرکات بے درپے مشین کی مانند ہوں تو انسان خوابیدہ ہوتا ہے۔

ہمارے درمیان مختلف شخصیتیں مختلف مشینوں کی مانند ہیں! کوئی ٹائپ کی مشین کی طرح ہے اور کوئی کپڑا سینے والی مشین کی طرح۔ اور بعض شخصیتیں تو ایسی ہیں جن کو قیمہ بنانے والی مشین (MINCING MACHINE) سے مشابہت دی جاسکتی ہے۔ یہ ہر مسئلہ کا قیمہ بناکر رکھ دیتی ہیں، مباحث کا آغاز ان سے ہوتا ہے۔ ان سے معاملات اُلجھتے ہی چلے جاتے ہیں، کبھی سُلجھتے نہیں۔ باشعور انسان مشین

نہیں ہوسکتا - اس بات کا احساس ہمیں صرف اس وقت ہوتا ہے جب ہم ذاتی مشاہدہ کرتے ہیں. جونہی ہماری نگاہ اپنی طرف منتقل ہوتی ہے ہماری مشین بیدار ہونا شروع ہوجاتی ہے. عبادت کے وقت بھی انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو یاد رکھے یعنی یہ کہ وہ ایک باشعور ہستی ہے اس کو عبادت کے وقت خود اپنا شعور ہونا لازمی ہے. اور اس بات کا بھی شعور ہونا لازمی ہے کہ وہ کس لئے عبادت کر رہا ہے اُسے ہر لفظ کے معنیٰ پر غور کرنا چاہیئے اور یہ بھی احساس ہونا چاہیئے کہ وہ خود یہ الفاظ دُہرا رہا ہے اور یہ کہ وہ خود بھی واقعتاً وہی شخص ہے جو عبادت کر رہا ہے! نہ کہ یہ اس کی متضاد اَنائیں ہیں جو عادتاً عبادت کرتی ہیں. عبادت کے لئے ایک احساس یہ بھی بڑا لازمی ہے کہ خود عبادت کرنے والے سے بڑھکر ایک اعلیٰ وارفع ہستی ہے جس کا درجہ انسان سے بہت بلند ہے اور جس نے انسان کو تخلیق دیا ہے اور جس کے سامنے وہ گردن جھکائے کھڑا ہے. اگر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو عبادت، عبادت نہیں، عادت ہے جو نقلی شخصیت کی متضاد اَنائیں حالتِ نیند میں اس سے کرواتی جارہی ہیں!

ہم نے عرض کیا تھا کہ شعورِ انسانی کے مختلف مدارج اور مقامات ہیں. ہر مقام کے علوم و معارف جُدا جُدا ہیں. کسی مقام میں نماز و تلاوت ضروری ہے اور کسی مقام پر ذکر و توجہ مناسب ہے. شعور کا ایک درجہ ہم نے کائناتی شعور (COSMIC CONSCIOUSNESS) بھی بیان کیا تھا اب چونکہ ہم اس کی تفصیل میں جانا چاہتے ہیں، ہم کائناتی شعور کو تجلیاتی شعور کہہ کر پکاریں گے. درحقیقت کائناتی شعور، تجلیاتی شعور کا ایک ادنیٰ درجہ ہے. کائناتی شعور ترقی کرکے تجلیاتی شعور کی حدود میں داخل ہوتا ہے. یہی تجلیاتی شعور مزید ترقی کرکے شعورِ ولایت اور شعورِ نبوت تک پہنچ جاتا ہے

نقشہ نیچے ملاحظہ فرمایئے

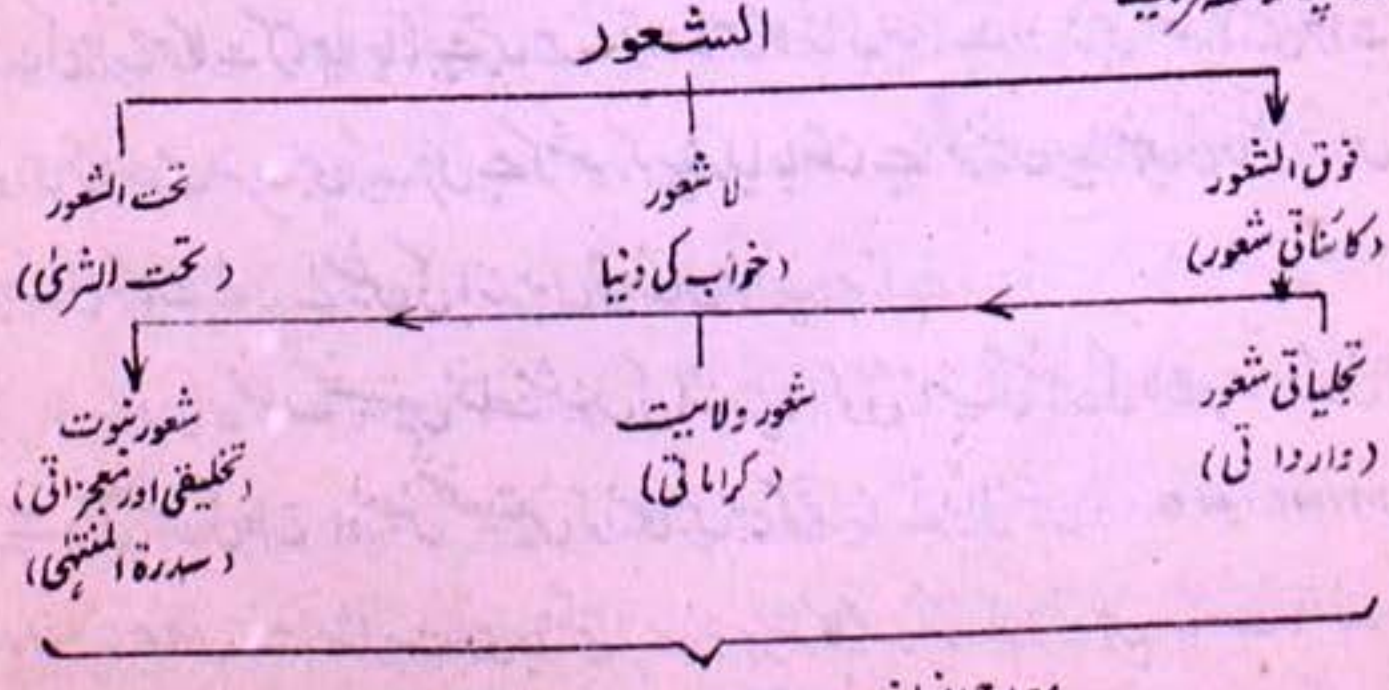

بیدلؔ نے کیا عمدہ کہا ہے وہ "اگر بہ نبوت ایمان داری باخطرات دلی جز بہ تعظیم پیش میا۔ واگر بہ تجلی یقین داری بہ ہیچ جانب چشم بے ادب مکشا" ع ولہٗ

آگہی وافسردگیِ دل چہ خیال است تادانہ بجوز چشم کشود است نہال است

جس طرح افسردہ دل، خود آگاہ اور خود شناس نہیں ہوتا، بعینہٖ اسی طرح جب تک دانہ آنکھ نہ کھول لے (یعنی بیدار نہ ہوجائے) درخت نہیں بن سکتا۔ بیدلؔ کے ہاں اس قسم کے رموز بہت موجود ہیں جو آج ہم مغرب کے فلسفہ اور نفسیات میں دیکھتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ع

گاؤ خر از آگہی انسان نگشت لیک آدمی گر ماند کے غافل شود خرمی شود

اور شاید اس طنز کا بھی یہی مطلب ہو۔ ع

خرِ عیسیٰ اگر بہ مکہ رود چوں بیاید ہنوز خر باشد

منفی جذبات پر قابو پاکر جب انسان کا شعور بیدار ہوتا ہے تو اس کی روح کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس حالت کو قوتِ قدسیہ کہا جاتا ہے اور اس وقت انسان نبوّت کے حدود میں داخل ہوجاتا ہے، وہ چہار سمتی زمان و مکان سے نکل کر ورأ الورأ تک جا پہونچتا ہے۔ اس کی ظاہری اور باطنی حس بالائی مراکز کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ وہ فرشتوں کو مجسّم دیکھتا ہے، اُن کی آوازیں سنتا ہے۔ یہ آواز وحی کی آواز ہوتی ہے۔ ملائکہ کا وجود حقیقی ہونے کے علاوہ روحانی بھی ہے جس کا زمان و مکان ہم سے بہت مختلف ہے۔ مگر چونکہ منفی جذبات پر متواتر جدّوجہد کے بعد قابو پاکر وجود کو بلند کرلیا جاتا ہے اس لئے انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ ملائکہ کا ادراک کرسکے۔

ان درجات میں مختلف طبیعتیں مختلف اثرات قبول کرتی ہیں۔ مثلاً نبی کا تجلیاتی شعور سراسر تخلیقی اور معجزاتی ہوتا ہے یعنی اس سے ایک نیا جہانِ اخلاق وجود میں آتا ہے جس سے شعور کو بیدار کرنے کا اصل مقصد یعنی قربِ الٰہی کا حصول سہل تر ہوجاتا ہے اور یہ مذاہب و ادیان کا مقتضا ہے کہ وہ محض تصورات ہی پر قناعت نہ کریں بلکہ اپنے مطلوب سے وصال کے آرزومند رہیں۔ اور وصال بھی کیسا؟ ع

گر شبے دست دہد وصل تو از غایتِ شوق تا قیامت نہ شود صبح دمیدن ندہم

(بو علی قلندر)

یہ قرب صرف عبادت اور مجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے جس میں اُس محبوبِ حقیقی کا ذکر ہو۔ اس ذکر کی انتہا ہم کہہ چکے ہیں کہ روحانی تجلیات پر ہوتی ہے۔ ؏

لا الٰہ گوئی، بگو، از روئے جاں تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں (اقبال)

تجلیاتِ شعور صوری بھی ہوتا ہے اور ذاتی بھی۔ تجلی صوری جس قسم کی بھی کیوں نہ ہو سیرِ آفاقی میں داخل ہے اور تجلی خواہ کسی ہی قسم کی کیوں نہ ہو منفی جذبات پر قابو پائے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ بات بھی ہم واضح کر آئے ہیں کہ منفی جذبات کا دارومدار دروغ گوئی پر ہوتا ہے۔ ہر منفی جذبہ انسانی قوت کو ضائع کر دیتا ہے۔ بلکہ جو قوت انسان کو روزمرہ کے کام کے لئے درکار ہوتی ہے وہ بھی ضائع ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ اس لئے ہے کہ اس کا انتشار غلط سمتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ یہ طاقت یا قوت کیا ہے؟ یہی تو روحانی قوت ہے جو ہر فعل کی محرک ہے۔ اگر اس روحانی قوت کا استعمال غلط ہو جائے تو یہ صرف نہ خود انسان کے لئے ہلاک ثابت ہوتی ہے بلکہ اپنے بُرے اثرات گرد و پیش پر بھی ڈالتی چلی جاتی ہے اور زہرِ قاتل ثابت ہوتی ہے۔ روحانی طاقت کا استعمال جب بھی غلط ہوگا زہرِ قاتل کا اثر رکھے گی۔

شخصیت (PERSONALITY) صورت (FORM) کا نام نہیں ہے شخصیت معنیٰ (CONTENT) کو کہتے ہیں اور یہ مترادف ہے روح[1] کے! یہی وہ معنیٰ ہے کہ جب بگڑتا ہے تو موجبِ فساد ہوتا ہے۔ صورت کے بگڑنے سے کبھی فساد پیدا نہیں ہوتا جس طرح ہم نے روح کو (ESSENCE) کہا ہے اسی طرح نفس یعنی (SENSUAL MIND) ذہن کے اُس حصّہ کو کہتے ہیں جس کا تعلق خواہشاتِ نفسانی

---

[1] حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مقام پر "روح کودک" کو "لوحِ سفید" سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ وہی بات ہے جو گذشتہ صفحات میں ہم لکھ آئے ہیں۔ ہم نے کہا تھا کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ بیدار پیدا ہوتا ہے (اگرچہ وہ اکثر وقت سوتا ہی رہتا ہے!) کیونکہ اس کی شخصیت پیدائش کے وقت ابھی ترتیب نہیں ہو پاتی۔ بچہ صرف (ESSENCE) یعنی روح لے کر آتا ہے اور وہ "لوحِ سفید" کی مانند ہوتی ہے اس لئے وہ جلد اثرات قبول کرتی ہے جس سے شخصیت ترتیب پاتی چلی جاتی ہے۔ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے اس کی شخصیت بیرونی اثرات کے تحت تربیت پاتی ہے۔ بچہ سوتا چلا جاتا ہے اور اپنی بیداری کھو دیتا ہے، تاوقتیکہ وہ دوسروں کی طرح جو اسے متاثر کرتے رہتے ہیں خود بھی سو جاتا ہے اور جب وہ سو جاتا ہے تو پھر ؏

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار (حضرت سعدی)

سے ہے یعنی تحت الشعور۔ ماں اور باپ کے مادۂ منویہ سے جو وجود پیدا ہوتا ہے وہ تین سمتی یعنی سہ ابعادی (THREE DIMENSIONAL.) ہوتا ہے۔ چوتھی سمت خارج طور پر روح کی شکل میں اُس کے اندر داخل ہوتی ہے اور اسی سے ورثہ (HEREDITY.) کے خصائل پیدا ہوتے ہیں کیونکہ آباؤ اجداد کے سلسلہ سے یہ متعلق ہوتی ہے۔ جرثومہ کے اندر جو نقش و نگار موجود ہے اس میں جان ڈال کر یہی اُبھارتی ہے! اس کا پھیلاؤ زمان کے اندر ہوتا ہے اور وقت کے پھیلاؤ کے ساتھ یہ چلتی ہے کہ اجداد کا زمانہ مختلف ہوتا ہے۔ اب یہ معاملہ ذرا مزید غور طلب ہے کہ آخر یہ شعور ہے کیا چیز؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شعور ایک قسم کا احساسِ خودی ہے کیونکہ یہ شعور کا پھیلاؤ ہی تو ہے جو ہمیں تجلیاتی شعور تک لے جاتا ہے۔ شعور کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ وجود کی وسعت بڑھتی ہے۔ اور پھر یہ وجود خود کیا ہے؟ یہ بھی تو خودی ہی ہے! مگر شعورِ زندگی کے لوازمات میں سے نہیں۔ زندگی حرکت کا نام ہے۔ ان معنیٰ میں ایک مشین بھی اپنی حرکت کے بموجب زندہ ہے! اگر انسان شعور کھو بھی بیٹھے تو بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ جیسا کہ حادثہ کی وجہ سے یا کلوروفارم سونگھانے سے یا نیند کے وقت۔ مگر حیاتِ انسانی باشعور زندگی کی مقتضی ہے اور یہی اس کا مقصدِ تخلیق ہے۔ اس کی مزید نشو و نما ہونا لازمی ہے تاکہ انسان حقائق کو پا سکے۔ شعور نہ حافظہ[1] ہے اور نہ ہی واہمہ اور نہ ہی اس کا تعلق

---

۱ انسانیت کے شعوری دائرے کی وسعت اور حدود اس ارض و سما سے ماورا پہونچتی ہیں۔ آپ غور فرمائیے انسان کے دماغ کی ساخت آج تک سائنسداں نقل نہیں کر سکا۔ ریڈیو اسٹیشن جن لوگوں نے دیکھا ہے انھوں نے برقی لہروں کو پکڑنے کے تاروں اور ان کنکشنوں (CONNECTIONS.) کو ضرور دیکھا ہوگا اور انھوں نے ریڈیو سٹ کے چند والو (VALVE) بھی دیکھے ہوں گے جن سے ریڈیو سٹ فضا سے آواز کی لہریں پکڑتا ہے۔ دماغ کے اندر جو خلیے ہیں وہ ان والوں (VALVES.) کی مانند ہیں۔ ان دماغی خلیوں سے ریشے نکل کر منتشر ہو جاتے ہیں جو جسم کے ہر عضو پر اپنا کنٹرول رکھتے ہیں۔ ان خلیوں کی تعداد ۱۴,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ ہے اور ان میں کا ہر خلیہ دوسرے کے ساتھ ایک سو کنکشنوں کے ذریعہ منسلک ہے۔ آپ مزید غور کیجیے گا کہ دنیا کی آبادی اس وقت ۲,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ ہے مگر دماغ کے یہ خلیے دنیا کی آبادی سے سات گنا زیادہ ہیں! ان خلیوں میں اس وقت تک زندگی ہے جب تک انسان زندہ ہے۔ یہ جو ساخت ہم نے دماغ کی یہاں بیان کی ہے تو یہ انسان کے جسم کے اندر متعدد اعضاؤں میں سے ایک عضو کی ساخت ہے۔ اگر ہم جسم کے ان مختلف اعضاؤں کے خلیوں کی تعداد کا اندازہ کریں تو محوِ حیرت رہ جائیں — ایک نطفۂ واحد سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے کیا کارخانہ تیار کیا ہے کہ ہر عضو کے خلیے دوسرے سے مختلف ہیں۔ کہیں اس جرثومہ نطفہ سے ہڈیاں بنا دی ہیں کہیں ناخن اور بال ہیں اور کہیں آنکھ اور دل ہے۔ اللہ اکبر۔ ہر عضو کے خلیے کا مزاج اور ساخت

محسوسات سے ہے اور نہ حرکات سے۔ کیونکہ ہمارے جسم کے اندر بہت سی حرکات جاری ہیں جن کا ہمیں مطلقاً احساس نہیں ہوتا۔ شعور کو شعور ہی کے ساتھ پھیلایا اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ مشینی حرکات سے اس میں اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ شعور ایک قسم کا موجوں یا لہروں کا جھمکا ہے (GROUP OF VIBERATIONS) جو ایک کثیر تعداد میں بڑی سُرعت کے ساتھ روشنی کی لہروں کی مانند ہمارے وجود کے ساتھ ٹکرا رہی ہیں۔ مگر اس شعور کی روشنی ہمیں مکمل طور پر میسر نہیں ہوتی، تا وقتیکہ ہم بڑھ کر اس روشنی کا استقبال نہ کریں اور جونہی ہم بڑھکر اس کا استقبال کرتے ہیں یہ ہمارے وجود میں جذب ہونا شروع ہو جاتی ہیں اس سے ہمارے شعور میں پھیلاؤ آتا ہے جس کی انتہا تجلیاتی شعور کی شکل میں نمودار ہوتی ہے اور پھر یہ تجلیاتی شعور کیا چیز ہے؟ ہم نے اس کو روشنی اور نور سے دی ہے۔ ذاتی مشاہدہ سے باطن پر ایک روشنی کی شعاع پڑتی ہے، مسائل کی پیچیدگیاں اور گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں جس سے ہمارے باطن کی تاریکیاں منور ہو جاتی ہیں۔ یہ روشنی کی شعاع کیا ہے؟ یہی تو شعور کی روشنی ہے جو جب جِلا پکڑتی ہے تو ایک روحانی نور بن جاتا ہے جس کا ارتقاء ذرات سے بڑھ کر شعاع میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ سورج کی روشنی کی مانند نہیں ہے۔ اس کی خصوصیت تو یہ ہے کہ ہمارے وجود (BEING) کے اندر جو خواص پنہاں ہیں اور باطن کی تاریکیوں کی وجہ سے وہ منور نہیں ہو سکتے، ان کو یہ منور کرتی ہے۔ اس سے شعورِ انسانی بیدار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور انسان اپنے آپ کو سمجھنے اور جاننے لگتا ہے۔ چونکہ انسان اپنی نقلی شخصیت کی وجہ سے ایک مصنوعی زندگی بسر کرتا رہتا ہے اور وہ اپنے منفی جذبات کے اندر گھرا رہتا ہے اور اُن پر قابو نہیں پا سکتا۔ اس لئے وہ جلد ہی اُس غلاف کے اندر گھس کر سو جاتا ہے جس کے اندر اس کو رہنے کی عادت ہے۔ وہ کبھی بیدار نہیں ہو سکتا۔ تخلیقِ انسانی سے اللہ تعالیٰ

(مسلسل) مختلف ہے۔ اگرچہ وہ ایک جرثومہ سے بنا ہے۔ اگر آپ ان تمام اعضاؤں کے خلیوں کی تعداد کا اندازہ کرنا چاہیں تو سائنسدانوں نے ان کی تعداد کا تعین کچھ ان ہندسوں میں کیا ہے۔ ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ احسن الخالقین کے اس شاہکار پر غور و تفکر ہمارا فرض ہے۔ تفکر ہی سے اس پیکرِ انسان کو سمجھا جا سکتا ہے اور اس وجود کے معانی سمجھ میں آتے ہیں۔ سطحی مشاہدہ سے نہیں۔" وفی انفسکم افلا تبصرون

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی
اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش (بیدل)

کا ایک منشا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان باشعور ہو جائے اور اپنے شعور میں بتدریج اضافہ کرتا چلا جائے۔ تاکہ اس خالقِ کائنات کے سربستہ راز اس پر شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ منکشف ہوتے چلے جائیں تاوقتیکہ وہ تجلیاتی شعور حاصل نہ کرلے۔

انسانیت اور آدمیت | ہم اس حقیقت پر کافی زور دے چکے ہیں کہ شخصیت کو بگاڑنے میں دروغ گوئی کا بڑا دخل ہے۔ اس کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اس مسئلہ پر مزید کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ دروغ گوئی کی ایک سنگین شکل اسلامی نقطۂ نگاہ سے غیبت اور تہمت ہے۔ چنانچہ انجیل میں بھی ابلیس کو ..... تہمت لگانے والا کہا گیا ہے۔ تمام وہ متضاد انائیں جن کا ذکر ہم کرتے چلے آرہے ہیں اور جو انسانی شخصیت کے اندر پوشیدہ بیٹھی ہیں، تمام تہمت لگانے والی انائیں ہیں۔ اور انسان کے مفاد کے خلاف کام کرتی رہتی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ تمام مل کر نفس کہلاتی ہیں۔ یہ مختلف حالات کے اندر بدلتی رہتی ہیں اور مختلف شکلیں اختیار کرتی رہتی ہیں۔ انسانی اخلاق، بود و باش، نشست و برخاست، گفتگو اور لباس، یہ سب انہی کی بدلتی ہوئی تصویریں ہیں۔ اس نفس کی جو مختلف صورتیں قرآن حکیم نے بیان کردی ہیں (۱) نفسِ امارہ (۲) نفسِ لوامہ (۳) نفسِ مطمئنہ۔ یہ تمام بھی اسی کی مختلف صورتیں ہیں۔ چنانچہ جب ان تمام متضاد اناؤں پر قابو پالیا جاتا ہے تو منفی جذبات کی حالت، لوامہ، مطمئنہ میں منتقل ہو جاتی ہے شخصیت پھر متوازن ہو کر راہِ اعتدال پر آجاتی ہے۔ درحقیقت گناہ بھی ان متضاد اناؤں کے کھنچاؤ میں افراط و تفریط کا نام ہے۔ اگر ان متضاد اناؤں کا کھنچاؤ خود اُن کی اپنی طرف جھک گیا تو یہ انسان کے قابو سے باہر ہو جاتی ہیں، انسان سے اس وقت گناہ سرزد ہونے لگتے ہیں اور جونہی یہ سب انسان کے قابو میں آگئیں تو ان سے کارِ ثواب پیدا ہونے لگتے ہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیت

(۱) وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى اور (۲) وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى

انہی امور کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ گویا تمام روحانی بادشاہی خود انسان کی اپنی شخصیت کے اندر مضمر ہے۔ وہ چاہے تو اسے دوزخ بنا دے اور چاہے تو اسے جنت میں منتقل کرلے۔ انجیل کا ایک مشہور مقولہ ہے۔ THE KINGDOM OF HEAVEN LIES WITHIN YOU

اور اقبال کہتا ہے :- ع خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل

قرآن کا حکم ان سب سے بڑھ کر ہے :-

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ — اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے

عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى — اور روکا ہو اس نے اپنے جی کو خواہش سے سو بہشت ہی اس کا ٹھکانا

یہاں خواہش سے مراد وہی منفی جذبات ہیں اور کچھ نہیں[۵]۔ لہٰذا منفی جذبات اور نقلی شخصیت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نقلی شخصیت انسان کا پرتو ہے اور حقیقی شخصیت آدمیت کا! منفی جذبات پر جب انسان قابو پالیتا ہے تو حقیقی شخصیت آدمیت کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اگر بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو انسانیت سراسر نقلی چیز ہے۔ اس کا تعلق تہذیب و تمدن سے ہے، باطن کی تربیت سے نہیں۔ آدمیت باطن کی تربیت کی متقضی ہے نقلی شخصیت بیرونی اثرات کے تحت ابھرتی ہے اور حقیقی شخصیت کا انحصار باطن کے ارتقاء پر ہے جس کے لئے منفی جذبات پر قابو پانا ازبس ضروری ہے۔ اسلامی فلسفۂ اخلاق انسانیت کو آدمیت کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اخلاقِ جلالی اور اخلاقِ ناصری میں بھی یہی فلسفہ کارفرما ہے اور حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی آدمیت کا درس دیتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی ایک نہایت عمدہ غزل یہاں نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ اس سے ہمارے موضوع کا ایک اہم پہلو بھی واضح ہو جائے گا۔ سنئے اور سر دھنئے :-

تنِ آدمی شریف است بجانِ آدمیت — کہ ہمیں لباس زیباست نشانِ آدمیت

اگر آدمی بچشم است و زبان و گوش بینی — چہ میانِ نقش دیوار و میانِ آدمیت

خور و خواب و خشم و شہوت شغب است جہل و ظلمت — حیوان خبر ندارد ز جہانِ آدمیت

---

[۵] یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو منفی جذبات ہم گنوا چکے ہیں اُن پر قابو پانا مقصود ہے۔ ان کا قلع قمع کرنا منظور نہیں۔ ان پر قابو پا لیا جائے تو یہی جذبات موجب برکت و فلاح بن جاتے ہیں۔ یہی عبادت بن جاتے ہیں اور انہی سے تخلیق وجود میں آتی ہے۔ ان پر قابو پا کر ہی حقیقی شخصیت نمودار ہوتی ہے۔ ان کے کلیتہً نابود کرنے سے تو انسان خود مٹ جاتا ہے، جب کشمکش دور ہو گئی تو جدوجہد کہاں رہی اور ارتقاء کیا ہوا؟ ارتقاء تو بہرحال جاری رکھنا ہی ہے! ورنہ عذاب و ثواب کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا!

بحقیقت آدمی باش وگرنہ مرغ باشد — کہ ہماں سخن بگوید بزبانِ آدمیت
طیرانِ مرغ دیدی تو زپائے بندِ غفلت — بدر آکہ تا ببینی طیارانِ آدمیت
مگر آدمی نبودی کہ اسیرِ دیو ماندی — ہمہ عمر زندہ باشی زروانِ آدمیت
رسد آدمی بجائے کہ بجز خدا نہ بیند — بنگر کہ تا چہ حد است مکانِ آدمیت
بہ نصیحت آدمی شو نہ بہ خویشتن کہ سعدی — ہم از آدمی شنید است بیانِ آدمیت

اس غزل میں ہر شعر کا مصرعہ اولاً شعور کے بیدار کرنے کا نسخہ ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ انسان کس قدر فریب خوردہ اور خیالات کا پیکر ہے کہ وہ حقیقت کو بھی حقیقت تصور کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کا سب سے بڑا وہم (ILLUSION) یہی ہے کہ اس کو کوئی وہم نہیں! اور یہی چیز اس کی نیند کو اور بھی گہرا کرتی چلی جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ایک دائرے کے اندر گھومتے رہتے ہیں اور کسی منزل کی طرف نہیں بڑھ رہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے منفی جذبات اور اُن کی تفصیل بیان کرکے آدمیت کے حدود کا تعین کردیا ہے اور ان حقائق کا اقرار ہی موجبِ بلندیِ وجود ہوتا ہے اور اس شعور کی بیداری کے حصول کو صرف اس قدر مشکل درپیش ہوتی ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا اعتراف نہیں کرتے۔ حالانکہ اُن کا اقرار ہی موجبِ بیداری ہے۔

ہمارے اندرونی حالات صرف اس وقت بدلنا شروع ہوتے ہیں جب ہمیں ان عیوب کا احساس ہوتا ہے۔ اصل فہم وادراک ہی اسی وقت اُبھرتا ہے جب ہمارا علم، وجود کی بلندی سے ہم آہنگ ہوکر پرواز کرتا ہے، طبیعت کے اندر بغض وعداوت تہمت وغیبت، غصہ وشہوت کے پیوست ہوجانے سے خودی بیدار نہیں ہوتی۔ یہ تمام کدورتیں ہیں جو تصفیۂ قلب کے منافی ہیں۔ قلب کو انہی سے پاک کرنے کا نام تصوف ہے۔ تخلیقِ انسانی سے بھی یہی منشاء اللہ تعالےٰ کا تھا۔ علمِ تصوف کا مقصد اصلاً یہی ہے کہ سوئے ہوئے انسان کو بیدار کرے۔ وہ روح تک پہونچتا ہے۔ انسان کے اندرونی یا باطنی ارتقاء سے اس کا واسطہ ہے۔ اور روح 'یاد رکھئے گا' ہرگز تقویت نہیں پکڑ سکتی جب تک کلام اللہ سے اُس کو بارآور (FERTELIZE) نہ کیا جائے۔ یہی راستہ اصل تلاشِ حق کا ہے۔ ہم اللہ تعالےٰ کو اس لئے بھی تلاش کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اندر

بیٹھے ہمیں اپنی تلاش پر مجبور کرتے رہتے ہیں کہ ہم انہیں تلاش کریں۔ اس جستجو میں کامیابی کا راز صرف تصفیۂ قلب ہے اور مسلمانوں کے لئے اس کا واحد ذریعہ تکرارِ کلمۂ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے۔ ذکر ان غلاظتوں کی شست و شو میں مدد دیتا ہے۔ اور قلب کی کدورتیں دور کرتا ہے' اگر ہم ان کدورتوں کو دور نہیں کریں گے تو یہ موجب تخریب اور فساد بن جائیں گی۔ کسی بھی ایک منفی جذبہ کے ساتھ وابستہ ہو جانا تخریب کو دعوت دینا ہے' خیالات کے تسلسل کو روکنا مقصود نہیں جس بات کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ صحت مند خیالات کی جستجو رہے۔ اس کا حصول بڑی جدّوجہد چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم روحانی جدّوجہد کی تاب نہیں لاسکتے۔ روحانی جدّوجہد منفی جذبات پر قابو پانے کا ایک ضابطہ ہے۔ شعور کا بیدار کرنا محنت چاہتا ہے یہ یک بہ یک ظہور میں نہیں آتا' اِلّا جب اللہ میاں خود نہ چاہیں۔ اس کے لئے بڑے سنگین مقامات سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جن سے صوفیائے کرام ریاضتوں کے بعد کہیں جا کر پہونچتے ہیں۔ یہ سب ریاضتیں منفی جذبات پر قابو پانے کے لئے کی جاتی ہیں۔ (بیدل کا مسلک یہاں بالکل الگ ہے' وہ ریاضتوں میں بھی اعتدال کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ مسلسل فاقوں کا طرفدار نہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ فاقہ صفرا پیدا کرتا ہے اور صفرا سے سودا پیدا ہوتا ہے' جس سے مختلف قسم کی شکلیں انسان کو نظر آتی ہیں جن کا تعلق حقائق سے مطلقاً نہیں ہوتا) جب جا کر کہیں انہیں تجلیاتی شعور حاصل ہوتا ہے۔ ہماری نگاہ میں بھی یہ ریاضتیں اور مشقتیں تجلیاتی شعور حاصل کرنے کے لئے لازمی نہیں۔ جو چیز لازم ہے وہ اعتدال ہے۔ تجلیاتی شعور[1] ریاضتوں کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے صرف توجہ اور ذکر کی ضرورت ہے تاکہ منفی جذبات پر قابو پایا جا سکے۔

---

[1] اس ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ آپ حجۃ اللہ البالغۃ جلد اوّل باب اسرار الصلوٰۃ میں رقمطراز ہیں:-

"اعلم ان الانسان قد یختطف الی الحظیرۃ المقدسۃ فیلتصق بجناب اللہ تعالیٰ اتم لصوق وینزل علیہ من ھنالک التجلیات المقدسۃ فتغلب علی النفس ویشاھد ھنالک مالا یفی اللسان علی وصفہ ثم یرد واجیث۔

یعنی۔ معلوم کرنا چاہیئے کہ کبھی آدمی حظیرۃ القدس کی سی حالت کو اخذ کر لیتا ہے۔ بارگاہِ خداوندی سے اس کو کمالِ اتصال و قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ وہاں سے اس پر مقدس تجلیات کا نزول ہوتا ہے۔ وہ ایسی حالت کو مشاہدہ کرتا ہے جس کو زبان بیان نہیں کر سکتی۔ اور پھر جہاں تھا وہاں کا وہیں آجاتا ہے

اللہ تعالےٰ نے انسان کی تخلیق کچھ اس انداز سے کی ہے کہ وہ ایک از خود نشو و نما پانے والا بنا دیا گیا ہے۔ اگر ہم اس نشو و ارتقار کے اختیاری پہلو کو تقویت نہ دیں اور اپنی مزید تخلیق میں اس کو مدد نہ دیں تو پھر ہمیں اللہ تعالےٰ سے کیا گلہ ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ۔ تو ہمارے اختیار میں جب دخل انداز ہوتے ہیں جب ہم اپنے منفی جذبات پر قابو پا کر بالائی مراکز سے رابطہ پیدا کر لیتے ہیں۔ پھر وہ اپنی طرف سے ہمارے قلب پر واردات و مکاشفات کے اثباتی پہلو منکشف کرتے چلے جاتے ہیں۔

انسان کی ایک بنیادی غلطی یہ رہی ہے کہ وہ معاشرے میں رہ کر بھی اپنا ہی مفاد سوچتا ہے۔ یہ رویہ وجود کی پستی کا اظہار ہے۔ جس قدر وجود میں بلندی آئے گی دوسروں کا مفاد پیش نظر رہے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ عفو و درگذر سے کام لیا جائے۔ یہ حقیقی شخصیت کی ایک اعلیٰ ترین شکل ہے۔ اس سے آدمیت اُجاگر ہوتی ہے۔ یہی اندازِ فکر احساسِ خدمتِ خلق کا موجب بنتا ہے۔ چنانچہ صوفیائے کرام کے ہاں خدمتِ خلق ایک اہم فریضہ ہے۔ اس پر عمل کر کے وہ اپنی حقیقی شخصیت کو نمودار کرتے ہیں۔ شخصیت جب بیدار ہوتی ہے تو اس کی صورت سے رعب و ہیبت ٹپکتی ہے۔ یہی وہ رعب اور ہیبت ہے جس کو عوام روحانیت اور نورانیت سے مخاطب کرتے ہیں۔ ورنہ اس میں رنگت کو تو کوئی دخل نہیں۔ سُرخ نہ سفید ہونا شخصیت کو روحانی یا نورانی نہیں بنا دیتا۔ اگر یہ بات ہوتی تو ہر یادری روحانی اور ہر نن (NUN) نورانی ہوتی! جب یہ تبدیلی آپ کے اندر واقع ہو جاتی ہے تو آپ کا گرد و پیش آپ سے متاثر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ع

قوتِ سلطان و میر از لا الٰہ ہیبتِ مردِ فقیر از لا الٰہ (اقبال)

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہم ہر لحہ اپنے آپ کو ایجاد کرتے چلے جاتے ہیں۔ نت نئے رنگوں میں خود اپنے آپ کو اپنے ہی سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہم جیسی نو ایجاد شخصیتیں ہر روز ایک دوسرے سے ملتی رہتی ہیں۔ یہی ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑتی بھی ہیں۔ یہی ایجاد شدہ چیز نقلی شخصیت ہے۔ یہ اپنی قوت اور توانائی کا غلط احساس اپنے آپ کو دلواتی رہتی ہیں۔ یہ رویہ یا اندازِ فکر (ATTITUDE) ہمیں بیدار نہیں ہونے دیتا۔ کیونکہ ہم ان شخصی ایجادوں کو حقیقی تصور کرتے رہتے ہیں اور بیدار ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے اس خصوصی اندازِ فکر کو نہ صرف بدل دیں بلکہ اسے فہم و ادراک

(UNDERSTANDING) کے درجے تک لے جائیں تاکہ اپنے متعلق ہماری خوش فہمیاں ہمارے ذہنی نشوونما کے لئے سدِّ راہ نہ بنی رہیں۔ آیئے اس مسئلہ کو ذرا کھول کر دیکھیں۔

انداز فکر و ادراک | یہ سمجھ لینے کے بعد کہ یہ ہوتا کیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ترتیب کیونکر پاتا ہے۔ انسان جب ایک خیال کو اپنے ذہن میں پختہ کر لیتا ہے تو وہ اس سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ یہ خیال منجمد ہو کر اندازِ فکر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً اگر آپ ہمیشہ یہ سوچنے کے عادی ہیں کہ آپ کی طرف لوگ متوجہ نہیں ہوتے اور آپ کو اپنے کام کا صلہ نہیں ملتا تو لازمی بات ہے آپ اپنے کو ستم زدہ تصور کرنے لگیں گے۔ یہ خیال آپ کے اندر پختہ ہو کر ایک رویہ یا اندازِ فکر ترتیب دیتا ہے۔ جب آپ اس خیال کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں (IDENTIFIED) تو یہ خیال آپ کے ذہن کے اندر ایک مواد کی طرح جمع ہو جاتا ہے۔ اس عمل کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں کرسٹلائزیشن (CRYSTALLISATION) کہتے ہیں اور یہی اندازِ فکر یعنی رویہ (ATTITUDE) کا موجب بن جاتا ہے اور یہ اندازِ فکر دوسروں کے ساتھ آپ کے رویہ کی حدِ فاصل قائم کر دیتا ہے۔ یہ رویہ نہ صرف آپ کا اپنا اطمینانِ قلب سلب کر لیتا ہے بلکہ بعض اوقات دوسرے بھی اس سے دکھی رہنے لگتے ہیں۔ آپ کی روحانی قوت اس سے زائل ہوتی رہتی ہے۔ یہ رویہ آپ کو لاشعور کے تہہ خانوں میں دھکیل دیتا ہے جہاں سے نکلنا بڑا ہی مشکل ہے۔ ذاتی مشاہدہ (SELF OBSERVATION) ان تمام مشکل مقامات سے انسان کو نکال کر باہر لے آتا ہے اور انسان بیدار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ وفی انفسکم افلا تبصرون۔

یہ ایک عجیب طرفہ تماشا ہے کہ جب ہم دوسروں کے اعمال کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اس وقت خود ہمارے اپنے عیوب ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ہم دوسروں پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ تمام نقائص خود ہمارے اندر موجود ہیں۔ ہم دانستہ طور پر اپنی خامیوں کی پردہ پوشی کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے کہ جو خامیاں ہمیں دوسروں میں نظر آئیں وہ اپنے میں بھی دیکھیں۔ ہمیں اپنے اس رویہ کو بدلنے کے لئے اپنے اندازِ فکر کو بدلنا چاہیئے۔ اس قسم کے رویہ سے قبولیتِ فہم کی استعداد پیدا نہیں ہوتی اور خود ہمارا فکر منجمد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہمارے فہم کا پھیلاؤ سکڑ کر ایک لکیر پر جم جاتا ہے۔

اور ہم لکیر کے فقیر بن جاتے ہیں۔ ہم عموماً اپنی گفتگو میں ایک ہی خیال کے ساتھ چمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ رواداری ہمارے قریب میں پھٹکنے نہیں پاتی۔ خواہ ایسے مباحث سیاسی ہوں یا مذہبی۔ اگر اس قسم کے احباب کی کسی وقت تردید یا اُن پر تنقید کر دی جائے تو اُن کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے اور فکر مفلوج ہو جاتا ہے۔ اس وقت آپ محسوس کرتے ہیں کہ ان لوگوں میں صحیح غور و فکر کی عادت کبھی تھی ہی نہیں۔ ایسے لوگوں کو خود بھی اپنی کوتاہیِ علم کا احساس ضرور ہوتا ہے، چونکہ اُن کا ایک اندازِ فکر ڈھل چکا ہوتا ہے، وہ اپنی عادت سے مجبور ہوتے ہیں۔ ایک غلط اور فرضی شخصیت اس کے پیچھے کارفرما ہوتی ہے۔ ایسا رویہ اکثر اُن لوگوں میں دیکھنے میں آتا ہے جن میں ابھی فہم و ادراک پیدا نہیں ہوا ہوتا اور جب تک یہ پیدا نہ ہو جائے ہم اشیاء کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر غور و تفکر کی عادت انسان میں موجود نہ ہو تو وہ اپنے منفی جذبات کے ساتھ چمٹ کر رہ جاتا ہے۔ اور ہر بحث و گفتگو میں اُلجھ کر برانگیخت ہو جاتا ہے۔ جب تک مرکزِ جذبات (قلب)، مرکزِ ذہن (دماغ) کے ساتھ تعاون نہ کرے، ان میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوتی اور فکرِ انسانی میں توازن و اعتدال نہیں آسکتا۔ ہم میں سے ہر ایک یہی کہتا ہے کہ وہ بہت کچھ جانتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں سے جو وہ جانتا ہے بہت کم سمجھتا ہے! انسان کو چاہیے کہ ان دونوں مراکز میں اتحاد پیدا کرے۔ جب یہ اتحاد و توازن پیدا کر دیگا تو پھر انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے، نہ یہ کہ دوسرے اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں! یہ مقام بہت اہم ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جونہی کسی پر تنقید کی تو وہ برہم ہو جاتا ہے اگر ہمیں مکمل طور پر اپنی خامیوں کا شعور ہو تو ہم برہم نہیں ہونگے، برہمی کی وجہ اکثر یہی ہوا کرتی ہے کہ ہم خود اپنے متعلق انتہائی حُسنِ ظن رکھتے ہیں اور جب کوئی اُس کے خلاف اظہار رائے کرتا ہے تو ہمیں ایک صدمہ سا محسوس ہوتا ہے۔ اگر انسان اس صدمے پر غور کرے اور ایسے صدمے اس کو متواتر آتے رہیں تو ممکن ہے وہ ان سے بیدار ہونا شروع ہو جائے۔ اصل عیب یہی ہے کہ ہم ان صدموں پر غور نہیں کرتے۔ ہم ایک خیالی دنیا میں بسنے کے عادی ہیں جسکو دور کا بھی واسطہ حقیقت سے نہیں۔ اگر آپ کو یہ معلوم کرنا ہو کہ آپ کا وجود کہاں تک بیدار ہوا ہے تو آپ یہ دیکھئے گا کہ کب اور کہاں آپ کا وجود ذہنی توازن پکڑتا ہے اور کس وقت آپ تحمل و بردباری کو ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں جہاں اور جس مقام پر اس کا تعین ہو جائے یہی آپ کے وجود کی بلندی کی سرحد ہوگی۔ اگر آپ کو تنقید کے

برداشت کرنے کا مادہ ہے تو یہ کیفیت آپ کی خودی کی بلندی اور وجود کی بیداری کی علامت ہوگی اگر ان حدود میں قیود نہیں تو آپ کی تمام جدّ وجہد لاحاصل ہے اگر آپ میں برداشت کا مادّہ نہیں تو آپ کی خودی بڑی ہی پست ہے۔ خواہ کتنے ہی بڑے عہدہ پر کیوں نہ پہونچ جائیں۔

جبر واختیار | گذشتہ صفحات میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر متضاد انائیں کام کر رہی ہیں۔ یہ انائیں انسان کی شخصیت کے اندر ایک سطحی درجہ رکھتی ہیں۔ یہ ارادے بناتی اور توڑتی ہیں۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ ان ارادوں کا خود خالق ہے۔ حالانکہ جب تک انسان کا شعور بیدار نہیں ہوتا اُس کے تمام ارادے انہی متضاد اناؤں کی تخلیق ہوتے ہیں۔ یہ متضاد انّائیں مختلف گروپ یا گروہ بنا لیتی ہیں اور ہر گروہ کی ایک ایک مخصوص شکل ہوتی ہے جس سے ایک خاص قسم کی شخصیت ترتیب پاتی ہے۔ حقیقی انا ان تمام گروہوں کو کنٹرول کرتی ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ خود حقیقی اَنا بیدار ہو، ورنہ وہ خود کسی نہ کسی گروہ میں شامل ہو جائیگی۔ حقیقی ارادے سطحی نہیں ہوتے۔ یہ تو شعور کی گہرائیوں سے اُبھرتے ہیں اور جب تک انسان بیدار نہ ہو جائے اس کی تمام حرکات مشین کی طرح بلا ارادہ حرکت میں آتی رہتی ہیں اور وہ مجبورِ محض ہوتا ہے، جونہی اس کا شعور بیدار ہونا شروع ہوا وہ خود ایک حد تک اپنے ارادہ کا مختار بن جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کے اندر جبر واختیار کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر بڑی عمدہ کتابیں موجود ہیں۔ ہم چاہتے ہیں یہاں اس مسئلہ پر جدید نفسیاتی تحقیقات کے مطابق ایک نئے انداز میں اظہارِ خیال کریں جو کہ ہمارے اس موضوع کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

جوں جوں انسان کا ذہن ترقی کرتا ہے، وہ ان مسائل کو مختلف زاویوں سے پرکھتا ہے۔ اور جس بلندی پر وہ پہونچتا ہے یعنی جہاں تک اس کا شعور بیدار ہوتا ہے، وہ اسی بلندی سے مسئلہ پر نگاہ دوڑاتا ہے۔ انسان کی شخصیت اس کی روح کو گھیرے ہوئے ہے اس بنیادی حقیقت پر ہم سیر حاصل بحث کر آئے ہیں۔ شخصیت اور رُوح دونوں مختلف قوانینِ قدرت کے ماتحت ہیں۔ شخصیت قضا کے تحت آتی ہے۔ یعنی قانونِ حادثات اس میں مداخلت کرتا ہے اور رُوح تقدیر کے ماتحت آتی ہے۔ چنانچہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کی زندگی سراسر تقدیر کے ماتحت ہوتی ہے کیونکہ اس میں رُوح (ESSENCE) کا دباؤ زیادہ ہوتا

ہے اس میں ابھی شخصیت مترتب ہو نہیں پاتی۔ یہ اس لئے بھی ہے کہ ابھی بچے کو اختیار کا شعور نہیں ہوتا۔ جونہی بچہ عمر میں بڑھتا ہے وہ اختیار و قضا کے تحت آتا چلا جاتا ہے۔ یہ مقام بڑا غور طلب ہے۔ اس مقام پر ہی بچہ حادثات کی دنیا سے دوچار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن جب نقلی شخصیت ترتیب پا جاتی ہے تو پھر وہ ایک بار لوٹ کر تقدیر کی گرفت میں آجاتا ہے۔ انسان کے اندر قضا و قدر اور جبر و اختیار کی یہ نقل و حرکت شخصیت کی تربیت پر منحصر ہے۔ اس لئے جبریہ و قدریہ جس مقام سے ان مسائل کا مطالعہ کرتے ہیں وہ دونوں اپنی جگہ درست ہوتے ہیں۔ ان کے نتائج شخصیت کی بیداری پر منحصر ہیں۔ ان مسائل کا مجموعی حل وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ ہمیں سمجھا گئے ہیں۔ وھو ھذا

" للعباد اختیار افعالھم نعم؛ لا اختیار لھم فی ذالك الاختیار۔

انسان کو اپنے افعال کا اختیار ہے، لیکن اس اختیار میں اُن کا کچھ اختیار نہیں۔!

شاہ صاحب رحمۃ اللہ نے اپنی عظیم تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کی پہلی جلد میں ہمارے اس موضوع سے متعلق دو نہایت عمدہ باب باندھے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) فی اسباب الخواطر الباعثۃ علی الاعمال (۲) لصوق الاعمال بالنفس و احصائھا علیھا۔

یہ ایک عجیب طرفہ تماشا ہے کہ انسان کی شخصیت میں خود اتنا ارادہ نہیں کہ وہ اپنے اعمال کو قابو میں رکھ سکے، لیکن وہ دوسروں کے حکم کی تعمیل کرنے کا کافی ارادہ رکھتا ہے! اگر ہم میں دوسروں کے حکم کی تعمیل کا ملکہ نہ ہوتا تو ممکن ہے ہمارا حوادث سے بچنا محال ہو جاتا۔ حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہمارے اس موضوع سے متعلق بڑا عمدہ ہے۔ کچھ تغیر کے ساتھ۔ ع

ہمہ از دستِ غیب می نالند سعدی از دستِ خویشتن فریاد!

گذشتہ صفحات پر ہم نے ایک عمل کا تین چار مرتبہ ذکر کیا ہے جس کو آؤسپنسکی (OUSPENSKY) نے صدمہ (SHOCK) کہا ہے۔ یہ طریقہ اُس نے شعور کو بیدار کرنے کا ایجاد کیا ہے۔ درحقیقت یہ ایک قوت ہے جسے انسان کی شخصیت کے اندر جو ذاتی مشاہدہ کے بعد عمل میں آتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ انسان

کے وجود کے اندر ایک مسلسل کش مکش چلتی رہتی ہے، کبھی وہ ارادہ بناتا ہے اور کبھی توڑ دیتا ہے کبھی تو وہ اثبات میں سوچتا ہے اور کبھی اس کی نفی کر دیتا ہے۔ اسی شک و گمان اور یقین کے متضاد رویہ سے یہ کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اس کشمکش کا تدارک اس تیسری قوت یعنی (SHOCK) صدمہ سے کیا جا سکتا ہے۔ ہر دنیاوی صدمہ روحانی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ جب آپ اپنے آپ کو بغور دیکھتے ہیں تو آپ کو اپنے منفی جذبات کا احساس ہوتا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی ایک اقرار کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جونہی اقرار کی فضا پیدا ہوئی تیسری قوت "صدمہ" کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہے۔ احساسِ منفی جو پشیمانی کی صورت اختیار کرتا ہے درحقیقت "صدمہ" ہی کی ایک شکل ہے۔ اس تیسری قوت کی عدم موجودگی میں انسان کے اندر ایک خلا سا پیدا ہو جاتا ہے۔ جب تک یہ خلا پُر نہیں ہوتا، شخصیت بیدار نہیں ہوتی اور نامکمل رہتی ہے اور انسان اپنے آپ کو مجبورِ محض تصور کرتا ہے اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ انسان ذہنی ترقی کر کے مختلف مدارج پر پہونچتا ہے اور مختلف مسائل کو مختلف رنگوں میں دیکھتا ہے تو یہ کیفیت تمام علوم و مسائل کے لئے پائی جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف علوم میں کئی متضاد مکتبۂ فکر موجود ہوتے ہیں۔ مذہب کو ہی لے لیجئے۔ یہاں ہر قسم کے ادیان نظر آتے ہیں۔ کوئی توحید کا قائل ہے تو کوئی بُت پرست اور منکرِ توحید ہے! اسی طرح ہر علم میں مختلف زاویہ ہائے نگاہ موجود نظر آتے ہیں۔ ذہنی ارتقاء میں ہر قسم کا مقام آتا ہے۔ بیدلؔ نے کیا عمدہ کہا ہے۔ ع

ہر کس ایں جا از مقام و حالِ خود گوید خبر
از زبانم حرفِ او گر نشنوی باور مکن

لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک مقام پر پہونچکر رک جاتے ہیں اور وہ مزید غور و فکر نہیں کر سکتے اگر ایسے لوگوں میں غور و فکر کا مادہ کام کرتا چلا جائے اور کوئی رکاوٹ افکار کی ترقی میں محسوس نہ کرے تو پھر وہ وہیں پہونچکر دم لے گا جو حقیقت ہوگی اور اس میں کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ اسی لئے قرآن کریم بار بار غور و تدبّر، تفکّر و تعقل کی تلقین کرتا ہے۔ اس سے انسان حقیقت الحقائق کی تہہ تک پہونچ جاتا ہے۔ چونکہ انسان اکثر ایسا نہیں کرتا، وہ مختلف مقامات پر پہونچکر رک جاتا ہے اور اپنے مقام کے مطابق اپنا فکر ڈھال لیتا ہے، جس سے متضاد خیالات وجود میں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ حقیقت ہمیشہ ایک ہی ہوا کرتی ہے ما عرفناک حق معرفتک کوئی وہاں پہونچتا ہے اور کوئی

بھٹک جاتا ہے۔ اور جو بھٹک جاتے ہیں وہ فکری دنیا میں موجبِ فساد ہوتے ہیں۔ دنیا کا ہر مسئلہ ایک حقیقت کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر سب لوگ اپنے فکر کی پرواز میں بڑھتے چلے جائیں تو اُن کے خیالات میں ہم آہنگی آتی چلی جائے گی اور کوئی تضاد باقی نہ رہے گا۔ اختلاف موجبِ رحمت نہیں ہے، اختلاف موجبِ زحمت ہے! مسائل کی تشخیص میں تضاد تب ہی نظر آئیگا جب فکر کی دوڑ برابر کی نہ ہوگی۔

حدیث متذکرہ نظرِ ثانی کی مقتضی ہے۔ راہِ اعتدال ہی حق کی راہ ہے۔ اور یہی حقیقت ہے۔

ارادہ و اختیار کے ساتھ ثواب و عذاب کا معاملہ وابستہ ہے۔ کیونکہ اگر انسان کو اختیار نہ دیا گیا ہوتا تو ثواب و عذاب کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ——— اب اس ضمن میں ایک آخری بات یاد رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالےٰ نے کوئی چیز بُری تخلیق نہیں فرمائی۔ اُس نے تمام چیزوں کو یکساں بنا دیا ہے۔ اور آپ کو ان کے خواص سے متنبہ کر دیا ہے کہ کونسی چیز کیسی ہے۔ وہ آپ کے اعمال کا خود جائزہ لیگا اور اس کے مطابق آپ کو اجر دے گا۔ یہ بات نہیں کہ آپ یا آپ کے احباب جس بات کو ناپسند یا پسند کریں اُس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ یہ تشخیص تو اللہ تعالےٰ نے اپنے لئے مخصوص کر رکھی ہے اور وہی بالآخر فیصلہ بھی صادر کرے گا۔ کیا آپ نے کبھی غور نہیں فرمایا کہ ایک چیز آپ کے لئے مضر ثابت ہوتی ہے مگر دوسرے کے لئے وہی چیز مفید ثابت ہو جاتی ہے۔؟

عالمے را سرگذشتِ رفتگان از کار بُرد
ہر کجا افسانہ باشد ہیچ کس بیدار نیست! (بیدلؔ)

نعتِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

ہندوستان کے مشہور و مقبول شاعر بہزاد لکھنوی کے نعتیہ کلام کا دلپذیر مجموعہ ہے جسے مکتبۂ برہان نے تمام ظاہری دل آویزیوں کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ جن حضرات کو آل انڈیا ریڈیو سے ان نعتوں کے سننے کا موقعہ ملا ہے وہ اس مجموعہ کی پاکیزگی اور لطافت کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲ر) مکتبۂ برہان اردو بازار۔ دہلی ۶